ایمان اور جہاد

خرّم مُرادؒ

منشورات

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ

نام کتاب : ایمان اور جہاد

مصنف : خرم مراد

طبع اول : فروری ۲۰۰۸ء

تعداد : ۲۰۰۰

ناشر منشورات

E-8، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ 54790

042-35252210 - 35252211

042-35252194

SMS ur Address:
0332-003 4909, 0320-543 4909

manshurat@gmail.com / @hotmail.com

www.facebook/manshurat

www.pinterest.com/manshurat

مطبع : سپوتنک پریس، بندر روڈ، لاہور۔

کوڈ : 00119

ISBN : 978-969-9894-87-9

قیمت : ۱۱روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بہت سی متنوع باتوں کے درمیان، زندگی کے طویل سفر کے لیے، کوئی ایک ایسی بات اپنے دامن میں ہم سمیٹ لیں جو ساری باتوں کے لیے سرچشمے اور جڑ کی حیثیت رکھتی ہو، جوسب باتوں کا خلاصہ ہو، اور اس کی حیثیت ایسی ہو کہ وہ اگر ہماری گرفت میں رہے تو غفلت ونسیان اورعزم وارادے کی کمزوری کا خواہ کتنا ہی ہمارے اوپر غلبہ ہو، ہم ہمیشہ لوٹ کر صحیح راستے اور صحیح منزل کی طرف چلنے والوں میں شامل ہو سکتے ہیں۔ زندگی کے اندر وہ کام سہل بھی ہوتا ہے اور ممکن بھی، جس کا سرچشمہ ہاتھ میں آ جائے۔ اگر ڈوری کے اندر بہت ساری گرہیں پڑی ہوں اور ڈوری کا سرا پکڑ لیا جائے تو گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں، اور جہاں بھی آدمی الجھتا ہے پھر وہیں سے شروع کرتا ہے یا وہیں پہنچتا ہے جہاں سے گرہیں کھولنا شروع کی تھیں۔ ہر تالے کے لیے الگ الگ چابی ہوتی ہے لیکن بعض چابیوں کی حیثیت شاہ کلید [master key] کی ہوتی ہے جس سے ہر تالا کھل جاتا ہے۔ ایک دفعہ ایمان اور جہاد کا صحیح فہم اور اس کے ساتھ صحیح وابستگی کی شاہ کلید ہمارے ہاتھ میں آ جائے تو زندگی کی شاہراہ پر جو بے شمار الجھنیں اور بے شمار مشکلات ورکاوٹیں ہمارے سامنے ہیں، ان کا علاج آسان ہے۔

ایمان کی حیثیت یہ ہے اور یہ بڑی صحیح بات ہے کہ سارے کے سارے دین دراصل ایمان کی دعوت ہے۔ قرآن مجید کو پورا کا پورا سمیٹ کر اگر ہم یوں کہیں کہ یہ ایمان کی پکار ہے تو غلط نہ ہوگا۔

آخرت کے سارے اجر' سارے انعامات اور فوز وفلاح کا تمام تر انحصار ایمان اور عمل صالح پر ہے اور اس کے ساتھ مشروط ہے۔ عمل صالح بھی دراصل ایمان ہی کا نتیجہ ہے۔ آخرت ہی میں نہیں بلکہ دُنیا کے اندر بھی قوموں کے لیے ترقی اور سربلندی کا مژدہ ایمان کے ساتھ سنایا گیا ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (الاعراف ۷:۹۶)

اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم اُن پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

میں اس ایمان کی بات نہیں کر رہا ہوں جس کے معنی لغت میں بیان کیے جاتے ہیں' جو فقہ کا موضوع ہے' جس کی بنیاد پر کافر اور مسلمان کے درمیان فرق کیا جاتا ہے' جو علم کلام کا مبحث ہے' جس میں اس کے مالَہٗ اور ماعلیہ پر بحث ہوتی ہے' بلکہ میرے پیش نظر وہ ایمان ہے جس کے وارث مکہ کے معمولی دکاندار، عرب کے ریگستانوں اور صحراؤں میں بھیڑ بکریاں چرانے والے گلہ بان اور مدینہ کے غریب کسان ہیں، جس ایمان نے ان کے دلوں کو پگھلا دیا اور ان کی شخصیتوں کو نئے سانچے میں ڈھال دیا، اور ان کو ساری دُنیا کا امام بنا کر کھڑا کر دیا۔

یہی ایمان دراصل مطلوب ہے۔ یہ ایمان اگر حاصل ہو جائے تو پھر یہ خود رہنما بن جائے گا۔ یہ راستے کھولتا چلا جائے گا' الجھنیں سلجھاتا چلا جائے گا' بھٹکتی قوموں کو سیدھی راہ پر لائے گا، اگر گر پڑیں تو اٹھا کر کھڑا کر دے گا، تھک کر بیٹھ جائیں تو ایک نیا ولولہ اور جوش دے گا' اور نئے سرے سے منزل کی طرف گامزن کر دے گا۔

یہ ایمان نہ ہو تو کوئی کاوش نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ بے شمار شکایات اپنے آپ سے بھی ہوتی ہیں

اور دوسروں سے بھی' اپنے اخلاق و کردار کے حوالے سے بھی ہوتی ہیں اور اپنے نظم اور جدوجہد کے حوالے سے بھی، یا یہ کہ لوگ وقت نہیں دیتے، قربانی نہیں دیتے، عذرات پیش کرتے ہیں، بات نہیں سنتے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب مسائل اپنی جگہ پر امراض نہیں ہیں۔ دراصل یہ ایک مرض کی علامات ہیں اور وہ مرض یہ ہے کہ ایمان کمزور اور ضعیف ہے۔ جتنا ایمان کمزور ہوگا' امراض کی کثرت بڑھتی جائے گی۔ اس لیے کہ اصل مرض ظواہر میں نہیں ہوتا بلکہ دلوں میں ہوتا ہے۔ مرض کی جڑ دل ہے اور دل ہی اس کا مسکن ہے۔

اگر دل صحیح، قوی اور مضبوط ایمان کا مسکن بن جائے تو ساری زندگی عمل صالح سے معمور اور آباد ہو جائے گی۔ اگر دل کے اندر ایمان کا بیج پڑ جائے تو زندگی کے اندر عمل صالح کی ایک لہلہاتی ہوئی فصل اٹھ کھڑی ہوگی۔ دراصل یہ ایمان ہی ہے جس پر ہر چیز کا انحصار ہے۔ انبیا علیہم السلام کی دعوت کی کامیابی کا راز ہی یہ ہے کہ انھوں نے پہلے دن سے اپنی توجہ اسی ایمان کو پیدا کرنے' اس کو مضبوط کرنے، تلاوت آیات سے اس کی آبیاری کرنے اور اس کے ذریعے سے تزکیۂ نفس پر مرکوز کر دی۔ اس کے نتیجے میں وہ جماعت پیدا ہوئی جس نے اپنا سب کچھ اس معلم ایمان کے اشارے پر قربان کر دیا، اور اس کی معیت میں جہاد کیا' اور اللہ کے دین کو دُنیا کے اندر غالب کر دکھایا۔

ایمان کیا ہے؟

اس کی مختصر اور جامع تعریف قرآن کی ایک آیت میں یوں فرمائی گئی ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (الحجرات ۴۹:۱۵)

حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے پھر انھوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں۔

ایمان کا دعویٰ کرنے والے دُنیا کے اندر بہت سے پائے جاتے ہیں۔ پہلے بھی ہوئے ہیں، آج بھی ہیں اور آیندہ بھی رہیں گے۔ لیکن یہی وہ کسوٹی، وہ معیار، وہ ترازو ہے جس پر جانچ کر، تول کر، پرکھ کر، یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ ایمان کا کون سا دعویٰ سچا ہے۔ وہ ایمان جس میں شک، تردد اور بے یقینی نہ ہو، جو اللہ کی راہ میں کھڑا کر دے اور جان و مال قربان کر کے جہاد پر آمادہ کر دے، وہی ایمان دراصل سچا ایمان ہے۔

اس آیت سے قبل کچھ آیات پر غور کیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ ظاہری اطاعت کا لبادہ تو سب اوڑھ سکتے ہیں، جس خاندان میں پیدا ہوئے ہیں اس خاندان کے اثر کے تحت، جس معاشرے میں رہتے ہیں اس معاشرے کے دباؤ سے، جہاں مفادات وابستہ ہوں ان مفادات کی خاطر، اور جب اسلام کو غلبہ حاصل ہو رہا ہو تو اس غلبے کو دیکھ کر، لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان سے کہو کہ یہ مت کہو کہ ہم ایمان لائے بلکہ یہ کہو کہ:

اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ ط (الحجرات ۴۹:۱۴)

''ہم مطیع ہو گئے۔'' ایمان ابھی تمھارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

اس لیے کہ ایمان تو وہ ہے جس کی تعریف یہ کی جا رہی ہے کہ جس میں کوئی شک اور تردد نہ ہو اور جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کے لیے کھڑا کر دے۔

یہ بات اچھی طرح جاننا اور سمجھنا ضروری ہے کہ سچ کو سچ کے طور پر جان لینا ایمان نہیں ہے۔ اس سچ کا زبان سے اقرار کرنا بھی وہ ایمان نہیں ہے جو مطلوب ہے۔ یہ وہ ایمان نہیں ہے کہ جو انسان کو اپنی زندگی کا بھی امام بنا دے اور سارے انسانوں کا بھی۔ قرآن مجید نے بار بار

اس بات کو واضح کیا ہے کہ سچی بات کا زبانوں پر آ جانا، ایمان کی علامت نہیں ہے۔ بڑی عجب بات ہے کہ ایک آدمی سچ بات کہہ کر بھی جھوٹا قرار دیا جاتا ہے۔

اِذَا جَآئَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ (المنفقون ۶۳:۱)

اے نبی ﷺ، جب یہ منافق تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ''ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللّٰہ کے رسول ﷺ ہیں''۔ ہاں، اللّٰہ جانتا ہے کہ تم ضرور اُس کے رسول ﷺ ہو، مگر اللّٰہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جُھوٹے ہیں۔

گویا ایک سچ بات کو زبان سے نکالنے کے باوجود بھی آدمی جھوٹا ہوسکتا ہے۔ لہٰذا سچ اور جھوٹ کا تعلق دعویٰ ایمان میں اس بات سے نہیں ہے کہ زبان سے جو بات نکل رہی ہے وہ سچ ہے یا جھوٹ۔ قرآن مجید کی ابتدا ہی میں یہ بات واضح کردی گئی تھی:

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَاهُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ (البقرۃ ۲:۸)

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللّٰہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے ہیں، حالانکہ درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔

ایک اور جگہ یوں ارشاد فرمایا:

وَیَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِکَ ؕ وَمَآ اُولٰٓئِکَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ (النور ۲۴:۴۷)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللّٰہ اور رسول ﷺ پر اور ہم نے اطاعت قبول کی،

مگر اس کے بعد ان میں سے ایک گروہ (اطاعت سے) منہ موڑ جاتا ہے۔ ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں۔

قرآن کی زبان میں کسی شک وشبے کی گنجایش نہیں ہے۔ بالکل صاف اور واضح بیان ہے کہ یہ لوگ مومن نہیں ہیں۔ گویا اس دعوے کے باوجود کہ ہم ایمان لائے اور اس اقرار کے باوجود کے ہم اطاعت کریں گے، جب ایمان کے تقاضوں سے روگردانی کی جائے گی تو مومن کہلائے جانے کے مستحق نہیں ٹھیریں گے۔

فقہ یا کلام کی زبان میں شاید یہ بات کافی ہو کہ آدمی ایمان کو مفصل اور مجمل پڑھ لے اور اللہ کے وجود کو مان لے تو وہ مومنین کے زمرے میں شمار ہوگا۔ لیکن قرآن مجید جس ایمان کی دعوت لے کر آیا، جس ایمان کی دعوت پر ہم اور آپ جمع ہوئے ہیں، جس ایمان کی دعوت کو ہمیں اس ملک کے اندر عام کرنا ہے، وہ اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اللہ کے وجود کو مان لینا ایمان ہے۔ یہ ایمان تو قرآن کے مخاطب کفار اور مشرکین کو بھی حاصل تھا۔ جب ان سے پوچھا جاتا تھا کہ آسمان وزمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ جواب دیتے تھے کہ اللہ نے۔ اللہ کے وجود، اس کے خالق ہونے کا اقرار ان کو بھی تھا، اور اس حد تک ایمان ان کو بھی حاصل تھا۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ خدا کو ایک مان لینا ہی ایمان ہے۔ یقیناً یہ ایمان کا پہلا قدم ہے اور یہ وہ ایمان ہے کہ جس کے مدعی یہودی بھی ہیں۔ اور فی الواقع وہ اللہ کو ایک مانتے بھی ہیں۔ عیسائی بھی تثلیث کے عقیدے کے باوجود خود اپنے مقام پر اس کا یقین رکھتے ہیں کہ ہم وحدانیت کے قائل ہیں لیکن وہ بھی مومن نہیں ہیں۔ لہٰذا ایمان ایک بالکل دوسری ہی چیز ہے۔

ایمان دراصل انسان کی پوری شخصیت اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینے کا نام ہے۔ اسی لیے قرآن مجید اس بات سے بحث نہیں کرتا کہ خدا ہے یا نہیں۔ وہ اس بات پر نہ دلائل قائم کرتا ہے

اور نہ اس کو منوا تا ہے۔اس کی دعوت ابتدا ہی سے یہ ہے کہ جو اپنے آپ کو صرف اسی کے حوالے کر دے اور اس کے علاوہ کسی کے حوالے نہ کرے‘ صرف اسی کا بن جائے اور اس کے علاوہ کسی کا نہ بنے، اس کا بندہ بن کر جیے اور اس کے علاوہ کسی کی بندگی کا قلاوہ اپنی گردن میں نہ ڈالے......قرآن مجید کے نزدیک یہ ایمان کی اصل دعوت ہے اور یہی ایمان کے اصل معنی ہیں۔

ایمان یہ ہے کہ جب اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرو تو اس یقین اور ایمان کے ساتھ کرو کہ اس کی بھیجی ہوئی ہر ہدایت، اس کی بتائی ہوئی ہر بات، اس کا دیا ہوا ہر حکم، اور اس کے ہر مطالبے میں فلاح اور کامیابی پوشیدہ ہے، دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔اس بارے میں ذرا برابر بھی شک وشبہ دماغ کے اندر موجود نہ ہو۔ جب پکارا جائے تو لبیک کہے، حکم دیا جائے تو اطاعت کرے، اور کچھ مانگا جائے تو لا کر حاضر کر دے، اور کوئی بھی چیز اس کی خدائی اور اس کی فرماں روائی سے بچا کر نہ رکھے۔ان معنوں میں ایمان ایک عہد اور ایک میثاق ہے۔ دراصل ایمان اقرار سے زیادہ بندے اور اس کے خالق کے درمیان ایک معاہدے کا نام ہے جس کے تحت بندہ اپنا سب کچھ اپنے خالق کے حوالے کرتا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِىۡ نَفۡسَهُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ ؕ (البقرۃ ۲:۲۰۷)

دوسری طرف انسانوں ہی میں کوئی ایسا بھی ہے جو رضاے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے۔

اسی بات کو قرآن مجید نے دوسرے انداز میں یوں بیان فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰى مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَنَّةَ (التوبۃ۹:۱۱۱)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔

اس کی بڑی پراثر اور بڑی سادہ تعبیر سید مودودیؒ کے الفاظ میں یہ ہے: ایمان لانے کے بعد تمھیں یہ کہنے کا حق حاصل نہیں ہے کہ یہ ہاتھ میرا ہاتھ ہے، یہ پاؤں میرے پاؤں ہیں، اور یہ آنکھیں میری آنکھیں ہیں، یہ جسم میرا جسم ہے اور یہ مال میرا مال ہے، اس لیے کہ ایمان لانے کے بعد تم ان میں سے ہر چیز کی ملکیت سے دستبردار ہوتے ہو اور اب یہ جسم کسی اور کے حوالے ہو چکا ہے، کسی اور کی ملکیت ہے۔ اب ایمان لانے کے بعد جو یہ کہے کہ یہ میرا ہے تو قانون کی زبان میں وہ دراصل نقص میثاق کا مرتکب ہوتا ہے، اور دینی لحاظ سے یہ شرک کا جرم ہے۔ اس لیے کہ جب مالک ایک بن چکا ہو تو کسی دوسرے کو مالک بنانا یا مالک کہنا قانون کی زبان میں نہ سہی لیکن وعظ و تبلیغ کی زبان میں اس کو شرک سے کم کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔

ایمان کو اگر پوری طرح سمجھنا ہو تو آج کی دُنیا میں چیزوں کو سمجھنے کے لیے ماڈل کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ایمان کو تفصیل کے ساتھ سمجھنے کے لیے ایک ماڈل آپ کے سامنے پیش کروں گا' اور یہ ماڈل دعوت توحید کے امام اعلی مقام حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ماڈل ہے۔ میں اس ماڈل سے اخذ کردہ تین چیزیں آپ کے سامنے رکھوں گا۔ ان پہلوؤں پر آپ غور کریں' ان پر اپنے آپ کو جانچیں اور پرکھیں' اور اس سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کریں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر سب سے پہلے جب حقیقت کا انکشاف ہوا تو ان کی زبان سے جو جملہ نکلا وہ یہ تھا:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (الانعام۶:۷۹)

میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اُس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

گویا راہِ ایمان میں پہلا قدم یہ ہے کہ زندگی کا ایک ہی رخ، ایک ہی مقصود اور ایک ہی قبلہ ہو اور وہ ہے: فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (الانعام ٦ : ٧٩)، آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا۔

مومن ہونے کے بعد مقصودِ اصل ایک خدا کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا ہے۔ زندگی کا قبلہ، رخ، ہدف اور منزل کا تعین ایمان سے ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اب ایمان مابعد الطبعی حقیقت کے اقرار کا نام نہیں رہا بلکہ پوری زندگی کا ایک رخ متعین کر دینا ہے۔ گویا ایمان کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ ہر طرف سے کٹ کر، ہر طرف سے الگ ہو کر، خدا کا حنیف بن کر زندگی صرف ایک ہی سمت میں رواں دواں ہو جائے۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھیے۔ نماز میں چہرے کا رخ خانہ کعبہ کی طرف ہوتا ہے اور یہ نماز کی بالکل لازمی شرط ہے۔ اگر رخ خانہ کعبہ کی طرف نہ ہو تو نماز صحیح نہیں ہوتی، اور اگر دوران نماز یہ معلوم ہو جائے کہ رخ غلط ہے تو فوراً رخ کو صحیح کر لینا لازم ہے۔ نماز میں آدمی یہ نہیں کر سکتا کہ کبھی دائیں دیکھے اور کبھی بائیں۔ ہمیشہ ایک ہی طرف دیکھے گا۔ صرف چہرے کا ہی نہیں، ہر چیز کا رخ خانہ کعبہ کی طرف ہوگا۔ سجدہ کرے گا تو پاؤں کی انگلیوں کا رخ خانہ کعبہ کی طرف ہوگا اور اگر بیٹھے گا تو ہاتھ کی انگلیوں کا رخ خانہ کعبہ کی طرف ہوگا۔ گویا مومن کا رخ سب سے کٹ کر اللہ کی طرف ہو جاتا ہے۔

اسی طریقے سے زندگی کا ایک ہی رخ اور ایک ہی قبلہ ہو سکتا ہے اور وہ ہے فاطر السمٰوٰت والارض (یوسف ١٢:١٠١)۔ اس کے بعد نہ دائیں دیکھنا چاہیے اور نہ بائیں، اور جس لمحے یہ

احساس ہو کہ قبلہ غلط ہے اسی لمحے قبلہ درست اور صحیح کرنا لازم ہے۔ جس طرح قبلے کی طرف رخ نہ ہو تو نماز نہیں ہوتی، اسی طرح اگر مومن کی زندگی کا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف نہ ہو تو وہ زندگی بھی صحیح نہیں ہوتی۔ یہ ایمان کے ماڈل سے پہلی چیز ہے جو ہمارے سامنے آتی ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ کوئی بھی چیز خدا کی فرماں روائی سے خارج نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اگر دل کی انتہائی گہرائیوں کے اندر چھپے ہوئے تصورات اور جذبات پر اس کے خوف اور محبت کی حکمرانی ہونا چاہیے تو بازاروں اور حکومت کے ایوانوں میں بھی اسی کی حکمرانی ہونی چاہیے۔ اگر زندگی کی سرزمین کا ایک چھوٹا سا حصہ اس کی فرماں روائی سے خارج کر کے کسی اور کے حوالے کیا جائے تو یہ ایک دوسرا خدا بنانے کے مترادف ہے، اس لیے کہ جو خدا سے آزاد ہو کر حکمرانی کا حق رکھے، وہ اپنی جگہ پر خدا ہے۔ لہٰذا پوری کی پوری زندگی خدا کے لیے ہونی چاہیے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ o لَا شَرِیْکَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ o (الانعام۶:۱۶۲۔۱۶۳)

کہو، میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سرِ اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔

لہٰذا جس طرح زندگی کے قبلۂ رخ اور منزل میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا، اسی طریقے سے زندگی کی پوری سرحدات جہاں تک بھی پھیلی ہوئی ہیں، خواہ وہ کسی فرد کا معاملہ ہو یا زندگی کے کسی بھی شعبے سے متعلق، ہمیشہ سے صف اول کے مسلمانوں کا یہی شیوہ رہا ہے۔

تیسری چیز اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمائی:

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (البقرۃ ۲:۱۳۱)

اس کا حال یہ تھا کہ جب اس کے رب نے اس سے کہا! ''مسلم ہو جا'' تو اس نے فوراً کہا: ''میں مالکِ کائنات کا ''مسلم ہو گیا''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات ہمارے لیے اس حوالے سے بہترین نمونہ ہے کہ جب بھی ان کے رب نے کہا کہ یہ کام کرو اور اپنے آپ کو میرے سپرد کر دو تو انھوں نے اپنے آپ کو اپنے رب کے آگے بچھا دیا کہ میں حاضر ہوں اور کہا کہ میرے رب مجھے تیری رضا کی خاطر کسی چیز سے انکار نہیں۔ اگر تیرا حکم ہے کہ باپ کو چھوڑ دوں تو میں اس کے لیے تیار ہوں۔ اگر باپ کے لیے دُعاے مغفرت ترک کرنے کا حکم ملتا ہے تو اس کے لیے تیار ہوں۔ گھر بار اور سرسبز و شاداب وادیوں کو چھوڑ کر بے آب و گیاہ وادیوں اور لق و دق صحرا میں نکل جانے کا حکم ملتا ہے تو اس کے لیے تیار ہوں۔ اگر ضعیف العمری میں اپنی محبوب بیوی اور لختِ جگر کو ایک ایسی وادی میں جا کر چھوڑ آنا ہے جہاں نہ پانی ہے نہ انسان تو اس کے لیے بھی تیار ہوں، اور اگر بیٹے کی گردن کے اوپر چھری رکھنے کا حکم ہے تو اس کے لیے بھی حاضر ہوں۔ غرض حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب بھی ان کے رب نے کہا کہ اطاعت کرو، حکم مانو اور اپنے آپ کو میرے سپرد کر دو، تو انھوں نے کہا کہ میں حاضر ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایمان کی یہ تین بنیادی شرائط پوری کر دیں۔ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ (البقرۃ ۲:۱۲۴)

میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے انھیں سارے انسانوں کا امام بنا دیا۔ یہ مقام اور یہ منصب فقہی

قانون اور کلامی ایمان کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ یہ اس ایمان کا نتیجہ تھا جس کا ماڈل میں نے آپ کے سامنے پیش کیا اور جس کی تین بنیادی شرائط اور تقاضے ہیں۔

ایمان کے اس ماڈل پر غور کیا جائے تو اس میں ایک پہلو نمایاں ہے اور وہ ہے تگ دو، بھاگ دوڑ اور سعی و جدو جہد کا۔ زندگی کا رخ بھی اسی لیے متعین کیا جاتا ہے کہ آدمی اس طرف مسلسل آگے بڑھے۔ جب آدمی پوری کی پوری زندگی کسی کے حوالے کرے گا تو اس کی بندگی اور اطاعت کسی جگہ پر جامد طور پر بیٹھ کر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے رواں دواں زندگی درکار ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے بڑے خوبصورت اور بڑے موثر پیرائے میں ایمان کی اس دعوت کو یوں بیان فرمایا ہے:

فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ ط (الذٰریات ۵۱:۵۰)

پس دوڑ واللہ کی طرف

بھاگنے کے الفاظ پر غور کیجیے۔ کسی دوڑ میں بھاگتا ہوا آدمی اپنی ہی دھن میں ہوتا ہے اور کوئی اور دھن اس کے دل و دماغ کو پراگندا نہیں کر سکتی ورنہ وہ ہار جائے گا۔ وہ ایک ہی راستے پر بھاگتا چلا جاتا ہے۔ وہ ٹھیر بھی نہیں سکتا، اور نہ ستا سکتا ہے۔ اس کی نگاہیں ہمیشہ اپنے اس ہدف پر جمی رہیں گی جہاں اسے پہنچنا ہے۔ اس لیے کہ جہاں نگاہ ہٹی، وہیں رفتار سست پڑ گئی اور جہاں رفتار سست پڑے گی وہیں منزل دور ہو جائے گی۔ اس لیے ففرّوا کے اندر ایک پوری تصویر کھنچ کر سامنے آ جاتی ہے کہ ایمان کی دعوت بھاگنے دوڑنے اور جدوجہد کی دعوت ہے' اللہ کی طرف چلنے کی دعوت ہے، اس کو ہدف اور مقصود بنا کر زندگی کو رواں دواں رکھنے کی دعوت ہے۔

یہ دعوت زندگی کے اندر ایک قوت اور طاقت بن کر نمودار ہوتی ہے۔ یہ گوشے میں بیٹھ کر ذکر و فکر کی دعوت نہیں ہے۔ یہ فلسفے اور کلام کی بحثوں میں، خدا کے وجود کو ثابت کرنے اور اس پر

گفتگو کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ توعمل کی دُنیا میں اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دینے کا نام ہے۔ اسی لیے انبیا کرام علیہم السلام نے جہاں اللہ کی بندگی کی دعوت دی وہیں اس کے ساتھ ساتھ یہ مطالبہ بھی کیا کہ میری اطاعت کرو۔ اگر ایمان اور بندگی کی دعوت کے ساتھ اطاعت کا مطالبہ نہ ہوتا تو ایمان اور بندگی کا رشتہ زندگی سے قائم نہیں ہوسکتا تھا۔

اسوۂ رسول ﷺ پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ایک گوشت پوست کا انسان جونظروں کے سامنے پیدا ہوا' پلا بڑھا' جوان ہوا' جو ہماری طرح بازاروں میں چلتا پھرتا ہے' شادی بیاہ کرتا ہے، ہماری طرح انسان ہے' اچانک کھڑے ہوکر اسی بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ میں رب العالمین کا نمایندہ ہوں' جس نے میری اطاعت کی اس نے رب کی اطاعت کی، میری اطاعت سے ہٹ کر رب کی اطاعت کوئی چیز نہیں ہے، لہٰذا میری اطاعت کرو۔

مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ (النساء ۴:۸۰)

جس نے رسول ﷺ اطاعت کی اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔

وہ صرف یہی بات نہیں کہتا بلکہ وہ اس سے آگے بڑھ کے یہ بھی کہتا ہے:

وَ لَا تُطِیۡعُوۡۤا اَمۡرَ الۡمُسۡرِفِیۡنَ ۙ(الشعراء ۲۶:۱۵۱)

ان بےلگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو۔

اگر بات صرف نبی کی اطاعت کے مطالبے تک محدود ہوتی تو پھر یہ دعوت ادھوری ہوتی، مگر جب اس کے ساتھ ایک منفی مطالبہ بھی کیا گیا کہ مسرفین، یعنی حد سے نکلنے والوں کی اطاعت نہ کرو تو پھر یہ ایک جاندار دعوت بن کر نمودار ہوتی ہے۔ اس میں پوری انسانی زندگی کو اپنی گرفت میں لینے کی سعی و کوشش ہے۔

اس نے دُنیا کے اندر ساری غالب قوتوں کو چیلنج کر دیا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مکہ کی زندگی میں ساری کش مکش پتھر کے چند بتوں کی پرستش کے اوپر تھی، وہ بڑی سخت غلط فہمی کے اندر مبتلا ہیں۔قرآن مجید کہتا ہے کہ جب یہ دعوت بلند ہوئی تو کفارِ قریش نے کہا:

اَنِ امْشُوْا وَ اصْبِرُوْا عَلٰٓی اٰلِھَتِکُمْ ج اِنَّ ھٰذَا الشَّیْءُ یُّرَادُo(صٓ ۳۸:۶)

چلو اور ڈٹے رہو اپنے معبُودوں کی عبادت پر۔ یہ بات تو کسی اور ہی غرض سے کہی جا رہی ہے۔

اس لیے کہ یہ ہمارے خلاف ایک سوچی سمجھی سازش ہے۔ اگر یہ دعوت صرف توحید کی دعوت ہوتی تو میرا گمان ہے فرعون سے لے کر کفارِ قریش تک، کوئی اس سے تعرض نہ کرتا' اور آج اگر واشنگٹن اور لندن میں توحید کی صدا بلند ہوتی ہے تو کسی کو اس سے تعرض نہ ہوتا۔ کفارِ قریش کو اگر اس سے بے چینی اور اضطراب تھا اور وہ اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ اس لیے کہ وہ دعوت صرف اتنی نہیں تھی کہ اللہ ایک ہے اور صرف اسی کی بندگی کرو بلکہ اس سے بڑھ کر یہ تھی کہ اس دعوت کو لانے والے انسان کی اطاعت کرو۔ یہ بھی اسی ایمان کا جز ہے، اور جو اس سے آزاد ہو کر اطاعت کا مدعی' دعویدار اور اس کا طالب ہو، اس کا انکار کرو۔ اس بات نے ہلچل مچا دی۔

آج بھی اگر کوئی اس ملک میں کھڑے ہو کر یہ بات کہے کہ میں رب العالمین کا نمایندہ ہوں' صرف میرا کہنا مانو اور کسی کا کہنا نہ مانو' کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ملک میں سکوت رہے گا اور اس میں حرکت اور اضطراب پیدا نہیں ہوگا۔لوگ جیل خانوں کے دروازے نہیں کھولیں گے اور پھانسی نہیں چڑھائیں گے تو یہ بات درست نہیں۔ یہ سب کچھ انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ اسی لیے ہوا کہ ان کی دعوت صرف یہ نہیں تھی کہ اللہ کو ایک مانو بلکہ یہ تھی کہ اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دو

اور میری اطاعت کرو اور جو میرے مخالف ہیں، حد سے نکلنے والے ہیں، اللہ کی بندگی سے نکلے ہوئے ہیں، ان کی اطاعت نہ کرو۔ وَ لَا تُطِیْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِیْنَ o (الشعراء ۲۶:۱۵۱) گویا ایمان کی دعوت محض یہیں تک نہیں ہے کہ انسان اپنے آپ کو پورے کا پورا اللہ کے حوالے کر دے بلکہ آگے بڑھ کر حق و باطل کی کش مکش کے میدان میں بھی داخل ہونا ہے اور یہیں سے ایمان اور جہاد کا تعلق پیدا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مومن وہ ہے جو اللہ اور رسول پر ایمان لائے۔ اس میں کسی قسم کے شک وشبے اور تردد کا شکار نہ ہو، اور اس کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کرے، اور یہی لوگ اپنے ایمان کے دعوے میں سچے ہیں۔ ان دونوں کو یوں ہی بے ربط جوڑ کے بیان نہیں کر دیا گیا۔ ان کا آپس میں گہرا ربط ہے۔ ایمان کا ناگزیر تقاضا جہاد ہے۔ جہاد کے بغیر ایمان کی صداقت کو جانچنے کا کوئی اور معیار نہیں۔

یہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ امت کے زوال کی وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ایمان اور جہاد کے جس رشتے کو قرآن مجید نے جتنے اہتمام کے ساتھ قائم کیا تھا وہ ٹوٹ گیا ہے اور ذہنوں سے محو ہو گیا ہے۔ جب قرآن مجید نازل ہو رہا تھا اس وقت ایک ایسے مومن کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا جو ہجرت اور جہاد نہ کرے، اور آج اربوں مسلمان ایسے پائے جاتے ہیں جن کے دلوں میں یہ خیال بھی نہیں گزرتا کہ ایمان کا لازمی تقاضا اللہ کی راہ میں جدوجہد، کوشش اور جہاد ہے۔ جہاد تو بہت بڑی بات ہے' قتال کی حد تک بھی حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ جس نے غزوہ نہیں کیا یا کم سے کم غزوے کی خواہش یا ارادہ نہیں کیا تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔ اس سے بڑی بات یہ کہ نفاق کے ایک شعبے پر اس کی موت آئے گی۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ، اللہ کی راہ میں جدوجہد، اور اللہ کی راہ میں جان و مال لگانا'

ان دونوں کے درمیان ایک ایسا رشتہ ہے، جسے لا ینفضو (......)، کم سے کم قرآن کی دعوت میں، قرآن کی لغت میں، قرآن کے کلام اور فقہ میں توڑا نہیں جا سکتا خواہ ہماری سمجھ بوجھ کے میدانوں میں اس تعلق کو توڑا جا سکتا ہو۔

جگہ جگہ اس بات کو مختلف انداز اور مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ جان و مال جو اللہ تعالیٰ نے خرید لیا ہے، اور جن کو ایمان لانے والے نے اس کے ہاتھ بیچ دیا ہے، اس کا مصرف اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ اللہ کے دین کی راہ میں جہاد کے لیے صرف ہو۔ سورۂ توبہ میں اس بات کو واضح کیا گیا ہے اور جان و مال سے جہاد سے آگے بڑھ کر قتال کی بات کی گئی ہے کہ جو اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں، ایسے لوگوں کے لیے خوشخبری دی جاتی ہے کہ جس جنت کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، مژدہ سنایا گیا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰةِ وَ الْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَ مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِیْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۝ (التوبۃ ۹:۱۱۱)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں۔ ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے تو راۃ اور انجیل اور قرآن میں۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اور اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے، یہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔

سورۂ ال عمران کی آخری آیات بھی اسی مضمون کو کھول کر بیان کرتی ہیں۔ مالک، ہم نے

ایک پکارنے والے کوسنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا......اور بہترین جزا اللہ ہی پاس ہے۔

جب لوگوں نے کہا کہ ہم ایمان لے آئے تو اس میں نہ ہجرت کا ذکر ہے، نہ راہ خدا میں گھروں سے نکلنے کا ذکر ہے، نہ ایذا رسانی کا ذکر ہے، نہ قتال کا ذکر ہے اور نہ مرنے مارنے کا، لیکن دُعا کے جواب میں یہ کہا جارہا ہے کہ ہاں تمھاری دُعا سن لی گئی ہے اور اب تم میں سے محنت کرنے والوں کی محنت یہ ہوگی کہ وہ گھر بار چھوڑیں گے، گھروں سے نکالے جائیں گے، ان کو ایذائیں پہنچیں گی، مارے جائیں گے، ان سے بہترین جزا کا میرا وعدہ ہے۔ وعدے کے لیے جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جو لوگ عربی زبان سے تھوڑا سا بھی تعلق رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اس میں یقینی گارنٹی کا پہلو ہے جو بہت کم استعمال ہوتا ہے۔

سورۂ توبہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو ایمان رکھتے ہیں وہ کبھی کوئی عذرات پیش کر کے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے جان نہیں چھڑاتے ہیں:

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَo(التوبة۹:۴۴)

جو لوگ اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہیں تو کبھی تم سے یہ درخواست نہ کریں گے کہ انھیں اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے سے معاف رکھا جائے۔ اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔

گویا یہ لوگ کبھی جھوٹے عذرات پیش کر کے، بہانے تراش کے، دُنیا کی معمولی مصروفیات کو ترجیح دے کر، اس بات میں پیچھے نہیں رہیں گے کہ اللہ کی راہ میں جان و مال سے جدوجہد کریں۔ یہ فرمایا گیا کہ اس کے مقابلے میں جو لوگ اجازت طلب کرتے ہیں، بہانے بناتے ہیں، رخصت مانگتے ہیں، معمولی معمولی مجبوریوں پر پیچھے بیٹھے رہ جاتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ پر

اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔قرآن مجید اس ایمان کی دعوت دے رہا ہے جو زندگی کو اس دُنیا میں جہاد کی راہ میں رواں دواں کر دے اور آخرت میں جنت تک پہنچا کر دم لے۔ یہی وہ ایمان جس کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ یہ ایمان ایک مردمومن کو اس بات کی دعوت نہیں دے سکتا کہ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے رک جائے' بلکہ یہ کمزور ایمان والے اور پیچھے رہ جانے والے ہیں جو آخرت کے اوپر ایمان نہیں رکھتے ہیں۔

یہ دراصل ایمان اور جہاد کی دعوت ہے جو قرآن مجید کا ماحصل ہے۔ یہی وہ دعوت ہے جس کی بنا پر اسلامی تحریک برپا ہوتی ہے۔اس تحریک کی ہم ہزار تعبیریں کریں لیکن اس کی مختصر اور موثر تعبیر اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے کہ یہ ایمان و جہاد کی دعوت ہے۔اس ایمان کی جو قرآن کے نزدیک ایمان ہے اور مطلوب ہے۔ اسی ایمان کی تجدید' اسی ایمان کو تازہ کرنے اور اسی ایمان کو پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

اگر یہ ایمان دل کو اپنا مسکن بنالے تو زندگی عمل صالح اور جہاد سے آباد ہو جائے گی۔ایک دفعہ اگر ایمان کا بیج دل کے اندر پڑ جائے تو ایمان صالح کا درخت برگ و بار لا کر رہے گا اور جنت کی نوید پوری ہو کر رہے گی۔

یہ وہ چیز ہے جس کو میں شاہ کلید کہتا ہوں۔ یہ وہ ڈوری کا سرا ہے جس کو اگر ہم پکڑ لیں تو ایک چھوٹے سے سکول میں' یا ایک چھوٹے سے گاؤں میں' یا بین الاقوامی سطح پر جو بھی الجھنیں اور مشکلات ہماری دامن گیر ہیں' دُنیا کی کشش جو اس راستے سے ہٹاتی ہے' ایمان و جہاد کی کلید ان بند دروازوں کو کھول دے گی۔اگر ہم اس پیرایے میں دعوت کو پیش کریں گے تو یہ دعوت کے لیے بند دلوں کو بھی کھول دے گی اور الجھنیں کو بھی سلجھا دے گی اور اس راہ کو آسان بھی کر دے گی۔ جب ہم غلط راہوں پر جائیں گے، جب ہمارے دلوں، ہماری نگاہوں اور ہماری زندگیوں میں

اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دُنیا میں چاروں طرف بکھرے ہوئے سونے کے بچھڑوں کی محبت گھر کر چکی ہو اور ان کی پرستش کے لیے ہم بنی اسرائیل کی طرح بے چین ہو کر لپکتے ہوں تو قرآن کی اس بات کو یاد رکھنے کی ضرورت ہے:

بِئْسَمَا یَاْمُرُ کُمْ اِیْمَانُکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَo (البقرۃ۲:۹۳)

اگر تم مومن ہو، تو یہ عجیب ایمان ہے جو ایسی بُری حرکات کا تمھیں حکم دیتا ہے۔
اس سے بڑا جگانے والا، چونکا دینے والا فقرہ کوئی نہیں ہوسکتا۔

بنی اسرائیل نے ایک سونے کا بچھڑا بنایا اور اس کی پرستش کی اور اس کی محبت ان کے دلوں میں رچ بس گئی۔ آج دُنیا کے اندر بے شمار سونے کے بچھڑے ہمارے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں، ان کی محبتیں ہماری رگ و پے کے اندر سرایت کیے ہوئی ہیں، اور ان کی پرستش کے لیے ہم بے چین اور بے تاب ہو کر لپکتے ہیں۔ گو وہ محسوس اور ظاہری صورتوں میں ہمارے سامنے نہ ہوں لیکن خدا کو چھوڑ کر ہم سے پرستش کے طلب گار ہیں...... ایسے ہر موقع پر ہم کو یاد کرنا چاہیے کہ بِئْسَمَا یَاْمُرُ کُمْ اِیْمَانُکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ o (البقرۃ۲: ۹۳)، یعنی اگر تم واقعی مومن ہو، تو کیا ایسی بری چیز کا حکم تمھارا ایمان تم کو دیتا ہے۔

ایمان سے مراد ایمان بالغیب ہے۔ قرآن مجید نے آغاز ہی میں بالغیب کی شرط عائد کر دی ہے۔ ایمان بالغیب کے بغیر تقویٰ اور صبر اور جہاد کی وہ خصوصیات پیدا نہیں ہوسکتیں جو لازمی اور ضروری ہیں۔ دُنیا کے نفع، دُنیا کے فائدے، ظاہر اور محسوس نگاہوں کے سامنے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ خواہ کوہ طور پر موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہو مگر وہ نگاہوں سے اوجھل ہے، جب کہ سامری کا بنایا ہوا سونے کا بچھڑا نگاہوں کے سامنے ہے۔ انسان کی آزمایش کے لیے اس کی فطرت میں یہ بات ودیعت کر دی گئی ہے کہ وہ جو چیز جلدی ملنے والی ہو، آج ملنے والی ہو، جو

ظاہر ہو، جو محسوس ہو وہ اس کے پیچھے لپکتا ہے اور اس کو اختیار کرتا ہے۔ اس لیے ایمان کی اصل کسوٹی یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کو جو احساسات سے ماورا ہیں، جن کو نگاہیں پا نہیں سکتیں، جن کو آدمی دیکھ نہیں سکتا، چکھ نہیں سکتا سونگھ نہیں سکتا، ان پر وہی ایمان یا کم سے کم اس سے ملتا جلتا ایمان نصیب ہو جائے جو ظاہر اور محسوس چیزوں پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے دعووں پر اتنا ہی یقین ہو جائے جتنا کہ دُنیا میں ملنے والی چیزوں کے وعدوں پر ہوتا ہے۔

آگ کی طرف ہاتھ جاتا ہے تو خود بخود واپس آجاتا ہے۔ کسی کے کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کوئی وعظ نہیں کرتا، کوئی درس نہیں دیتا اور نہ کوئی تقریر کرتا ہے۔ دل کہتا ہے کہ یہ آگ جلانے والی ہے۔ یہ یقین اور ایمان ہے۔ ناسمجھ، بچہ اگر آگ کی طرف جارہا ہو تو ماں اور باپ مضطرب اور بے چین ہو کر اس کی طرف لپکتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ ناسمجھ ہے اور اس کو آگ سے بچانا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول نے جس چیز کا وعدہ کیا ہے اس پر ایمان اگرچہ غیب میں ہو لیکن یہ ایمان کم سے کم اس درجے کا تو ہو جتنا آگ پر کہ یہ جلا ڈالے گی۔ تب فی الواقع تقویٰ اور صبر کی وہ صفات پیدا ہوتی ہیں جو ایمان اور جہاد کے لیے ضروری ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو ہم اس ایمان سے بھی محروم ہیں۔ سارے دعووں کے باوجود۔ اس ایمان بالغیب کا عشرعشیر بھی ہمارے اندر نہیں ہے۔ جتنا ایمان بالغیب مضبوط ہوگا اتنا ہی ہم یہ جان لیں گے کہ ایمان کے ذریعے جنت تک پہنچنے کی راہ جہاد کی راہ ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ○ (اٰل عمرٰن ۳:۱۴۲)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یُوں ہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم وہ لوگ ہو جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے

والے ہیں۔

ان تینوں چیزوں کا رشتہ قائم ہونے کے بعد ایمان جس کا مطلوب جنت ہے اور جس کی راہ جہاد ہے، اس کے لیے ایمان بالغیب ضروری ہے۔

ہماری کیفیت یہ ہے کہ دُنیا کا چھوٹے سا چھوٹا نفع اگر کوئی کمزور اور ضعیف انسان ہمارے سامنے پیش کر دے تو ہم اس کی طرف لپکتے ہیں۔ اگر کوئی یہ کہہ دے کہ یہ زمین آج خرید لو' اگلے سال اس کی قیمت دگنی ہو جائے گی تو ہم گھر جائیں گے، جیبیں ٹٹولیں گے' بینک سے پونجی نکالیں گے' خواہ بیوی کے زیور بیچیں لیکن زمین خرید لیں گے۔ اس لیے کہ ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ نفع کل ملنے والا ہے۔ دوسری طرف اگر اللہ تعالیٰ یہ فرمائے کہ تم ایک دانہ دو گے تو اس کے بدلے میں، میں سات سو گنا واپس کروں گا بلکہ اس سے بھی زیادہ، مگر ہماری جیب نہیں کھلے گی۔ جیب اس لیے نہیں کھلتی کہ دل کھلا ہوا نہیں ہے اور وہ اس لیے کہ دل یقین سے محروم ہے۔

ہمارے بچے لپک کے اسی آگ کی طرف جا رہے ہیں کہ جو آخرت میں ان کے جسموں کو جلانے والی ہے، مگر ہم مطمئن بیٹھے دیکھتے رہتے ہیں۔ ہم ہنستے بولتے رہتے ہیں' ہم ان کی حرکتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں' اس لیے کہ ہمیں جس طرح دُنیا کی آگ کے اوپر یقین ہے اس طرح آخرت کی آگ کے اوپر یقین نہیں ہے۔

ہمارے اردگرد رہنے والے لوگ اگر اس راہ کی طرف جا رہے ہیں کہ جو آگ کی طرف جانے والی ہے مگر ہمیں یاد نہیں آتا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ لوگو! میری مثال اور تمھاری مثال ایسی ہے جیسے کسی نے آگ کا الاؤ روشن کیا ہو اور تم پروانوں کی مانند دوڑ دوڑ کر اس آگ میں گر رہے ہو، اور میں تمھیں کمروں سے پکڑ پکڑ کر بچا رہا ہوں کہ خدا کے بندو! اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ۔ اس لیے کہ خدا کا رسول اس آگ، جنت، آخرت اور خدا کے وعدوں پر اتنا ہی یقین

رکھتا ہے جتنا کہ آنکھوں سے دیکھی ہوئی چیزوں پر رکھتا ہے۔اس لیے وہ آگ میں گرتا ہوا دیکھ کر صبر اور چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔اس لیے بھی کہ انسانوں کے لیے غم اور درد اس کے دل میں ہے۔

آج ہمیں اپنے آپ کو اسی ایمان اور جہاد سے وابستہ کرنے کا عزم و ارادہ کرنا چاہیے۔ تاریخ اسلامی اس بات پر شاہد ہے کہ مسلمان جب کبھی کھڑے ہوئے ہیں، انھوں نے قربانیاں دیں تو ہمیشہ جہاد اور جنت کی خاطر قربانیاں دی ہیں۔اس کے علاوہ کوئی بھی چیز کسی قوم کو اسلام کے لیے کھڑا نہیں کرسکتی ہے۔ ذاتی تربیت اور تزکیے کے لیے ہی نہیں، بلکہ ہماری دعوت کے لیے بھی، اگر کوئی شاہ کلید ہے تو وہ یہی ایمان، جہاد اور جنت کی دعوت ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

❖❖❖